مشتاق احمد یوسفی

(حالاتِ زندگی)

مشتاق احمد یوسفی ۱۹۲۳ء میں ٹونک (راجستھان) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ٹونک میں حاصل کی۔ بی۔اے آگرہ سے کیا۔ پھر علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ جہاں سے ایم۔اے اکنامکس اور ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔

ایک غیر ملکی بینک کی ذیلی شاخ میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان آگئے اور متعدد ملکی اور غیر ملکی بینکوں سے وابستہ رہے۔ ۱۹۷۴ء میں ایک نجی بینک کے صدر مقرر ہوئے۔ اُن کی ایک تصنیف ''خاکم بدہن'' پر انہیں آدم جی انعام بھی ملا۔

مشتاق احمد یوسفی نے زندگی کا بہ غور مشاہدہ کیا اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے کر کے اپنے زمانے کے ادبی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی موضوعات کو کہیں مزاح اور کہیں طنز کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اُن کے تمام مضامین ہماری معاشرتی زندگی کے عنوانات ہیں۔ جس کو انہوں نے اپنی ذہانت اور برجستگی سے طنز وظرافت کے باوقار نمونے بنا دیے۔

یوسفی نے اپنی تحریروں کے ذریعے طنز و مزاح کا جو رنگ اختیار کیا۔ اس میں حقائق کی تلخیوں اور صداقت کے مختلف پہلوؤں کو طنز و مزاح کی چاشنی دے کر زیادہ مؤثر انداز میں پیش کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہنسنا ہنسانا بھی ایک عبادت ہے لہٰذا طنز و مزاح کو وہ عبادت تصور کرتے ہیں۔

ان کی تحریروں کی خصوصیات میں عمدہ اور چست فقرے بعید از قیاس تشبیہات و استعارات، محاورات، ضرب الامثال اور مقبول اشعار کی رد و بدل سے مضحکہ خیز صورتحال پیدا کرنا شامل ہے۔ اُن کی تحریریں مسرت کا تاثر تو بخشتی ہیں، لیکن پھکڑ پن پیدا نہیں ہوتا۔ طنز و مزاح کی آمیزش ان کی تحریروں کو دہری کاٹ عطا کرتی ہے کہ نشانہ کوئی اور ہو اور چوٹ کسی اور کو لگے۔

مشتاق یوسفی کی تحریر میں لطیفہ گوئی دلچسپ صورت حال اور کرداری خاکوں کا کمال ہے۔ جملوں میں ذومعنویت مزاحیہ رنگ پیدا کرتی ہے۔ ان کے مزاح کا رنگ معنوی گہرائی نہ رکھنے کے باوجود دلچسپ اور پُرکشش ہے اس پُرکشش انداز اور لطیفہ گوئی کے پیرائے میں کبھی کبھی وہ معاشرتی ناہمواریوں پر گہرا طنز کر جاتے ہیں۔ ان کے کردار جیتے جاگتے اور ہماری روزمرہ زندگی میں ہمارے اِرد گرد چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اُن کی تصانیف میں چراغ تلے، آبِ گم، زرگزشت، شام شہر یاران اور خاکم بدہن شامل ہیں۔ آپ نے ۲۰/جون ۲۰۱۸ء کو کراچی میں وفات پائی۔

سنہ

(مشتاق احمد یوسفی)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو جدید اُردو ادب میں طنز و مزاح کی اہمیت سے روشناس کروانا۔
۲۔ طلبہ سے کسی بھی ادبی علمی، صحافتی موضوع پر درست لب و لہجے اور تلفظ کے ساتھ 10 منٹ سے زیادہ لکھی ہوئی تقریر کروانا۔
۳۔ مشتاق احمد یوسفی کے اُسلوبِ نگارش سے آگاہی دینا۔

خاص الفاظ و تراکیب: نپولین ۔ مشاہیرعالم ۔ میلبورن ۔ موقوف ۔ کلیدی ۔ حروفِ ابجد ۔ استخراج
لینن ۔ مجسم ۔ بن مانس ۔ قبل از مسیح

اوروں کا حال معلوم نہیں۔ لیکن اپنا تو یہ نقشہ رہا کہ کھیلنے کھانے کے دن پانی پت کی لڑائیوں کے سن یاد کرنے اور جوانی دیوانی نپولین کی جنگوں کی تاریخیں رٹنے میں کٹی۔ اس کا قلق تمام عمر رہے گا جو راتیں سکھوں کی لڑائیوں کے سن حفظ کرنے میں گزریں وہ فقط لطیفوں کی نذر ہو جاتیں تو زندگی سنور جاتی۔ محمود غزنوی لائقِ صد احترام سہی لیکن ایک زمانے میں ہمیں اس سے بھی یہ شکایت رہی کہ سترہ حملوں کے بجائے اگر وہ جی کڑا کر کے ایک ہی بھرپور حملہ کر دیتا تو آنے والی نسلوں کی بہت سی مشکلات حل ہو جاتیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ پیدا ہی نہ ہوتیں (ہمارا اشارہ مشکلات کی طرف ہے)

اولادِ آدم کے سر پر جو گزری اور گزر رہی ہے اس کی ذمہ داری مشاہیرِ عالم پر عائد ہوتی ہے یہ نری تہمت طرازی نہیں بلکہ فلسفہ تاریخ ہے۔ جس سے اس وقت ہمیں سروکار نہیں ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ بنی نوع آدم کو تاریخ نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا؛ جتنا مؤرخین نے، انہوں نے اس کی سادہ اور مختصر سی داستان کو یادگار تاریخوں کا ایک ایسا کیلنڈر بنا دیا جس کے سبھی ہندسے سرخ نظر آتے ہیں۔ چناں چہ طلبہ بوجوہ معقول ان کے حق میں دعائے مغفرت نہیں کر سکتے اور اب ذہن بھی ان تعیناتِ زمانی کا اس حد تک خوگر ہو چکا ہے کہ ہم وجودِ انسانی کا تصور بلا قیدِ سن و سنت کر ہی نہیں سکتے۔

جو سن نہ ہوتے تو ہم نہ ہوتے
جو ہم نہ ہوتے تو غم نہ ہوتے

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مؤرخین سن کو ایک طلسمی طوطا سمجھتے ہیں جس میں وقت کے ظالم دیو کی روح مقید ہے کچھ اسی قماش کے عقیدے پر میلبورن کے خضر صورت آرچ بشوت مانکس نے تین سال پہلے طنز کیا تھا کہ جب ان کی ۹۳ویں سالگرہ پر ایک اخبار کے رپورٹر نے اپنی نوٹ بک نکالتے ہوئے بڑے گمبھیر لہجے میں دریافت کیا۔

"آپ کے نزدیک ۹۳ برس کی عمر تک پہنچنے کی اصل وجہ کیا ہے"؟

''برخوردار! اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ میں ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوا تھا''۔

اور کچھ مورّخین پر موقوف نہیں۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں میٹرک کے امتحان سے کچھ دن قبل مرزا عبدالودود بیگ نے اس راز کو فاش کیا (ہر چند کہ طلبہ اسے کھولا نہیں کرتے) کہ شقی القلب ممتحن بھی سن ہی سے قابو میں آتے ہیں۔ چناں چہ زیرک طالب علم ہر جواب کی ابتدا کسی نہ کسی سن سے کرتے ہیں خواہ سوال سے دور کا تعلق بھی نہ ہو۔ ذاتی مشاہدے کی بنا پر عرض کرتا ہوں کہ ایسے ایسے غبی لڑکے جو نادر شاہ درانی اور احمد شاہ ابدالی میں کبھی تمیز نہ کر سکے۔ اور آج تک چنگیز خاں کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ محض اس وجہ سے فرسٹ کلاس آئے کہ انہیں قتل عام کی تاریخ اور پانی پت کی حافظہ شکن جنگوں کے سن ازبر تھے۔ خود مرزا، میٹرک میں بس اس وجہ سے اول آ گئے کہ مرہٹوں کی تمام لڑائیوں کی تاریخیں یاد تھیں۔

ترقی یافتہ ممالک میں مارچ کا مہینہ بے حد بہار آفریں ہوتا ہے۔ یہ وہ رُت ہے جس میں سبزہ اوس کھا کھا کر ہرا ہوتا ہے اور ایک طرف دامنِ صحرا موتیوں سے بھر جاتا ہے تو دوسری طرف

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزر گاہِ خیال

اس تمہیدِ دل پذیر سے میرا یہ مطلب نہیں کہ اس کے برعکس پس ماندہ ممالک میں اس مست مہینے میں پت جھڑ ہوتا ہے اور۔

بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے کھاد

توجہ صرف اس امر کی جانب دلانا چاہتا ہوں کہ برصغیر میں یہ فصلِ گل آبادی کے سب سے معصوم اور بے گناہ طبقے کے لیے ہر سال نئے ذہنی کرب کا پیغام لاتی ہے، جس میں چار سال سے لے کر چوبیس سال کی عمر تک سبھی مبتلا نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ سالانہ امتحانوں کا موسم ہوتا ہے۔ خدا جانے محکمہ تعلیم نے اِس زمانے میں امتحانات رکھنے میں کون سی ایسی مصلحت دیکھی، ورنہ عاجز کی رائے میں اس ذہنی عذاب کے لیے جنوری اور جون کے مہینے نہایت مناسب رہیں گے۔

بات سے بات نکل آئی، ورنہ کہنا یہ چاہتا تھا کہ اب جو پیچھے مڑ کے دیکھتا ہوں تو یک گونہ افسوس ہوتا ہے کہ عمرِ عزیز کی پندرہ سولہ بہاریں اور میوہ ہائے باغِ جوانی اسی سالانہ جانکنی کی نذر ہو گئے۔ یادش بخیر وہ سلونا موسم جس کو اگلے وقتوں کی زبان میں ''جوانی کی راتیں، مرادوں کے دن'' کہتے ہیں، شاہ جہاں کے لڑکوں کی لڑائیاں اور فرانس کے تلے اوپر اٹھارہ لوئیوں کے سنِ ولادت و وفات یاد کرنے میں بسر ہوا اور تنہا فرانس کا کیا مذکور برطانیہ کی تاریخ میں بھی چھ عدد جارج، آٹھ آٹھ ایڈورڈ اور ہنری گزرے ہیں جن کی پیدائش اور تخت نشینی کی تاریخیں یاد کرتے کرتے زبان پر کانٹے اور حافظے میں نیل پڑ گئے تھے۔ قیاس کہتا ہے کہ تاریخی نام رکھنے اور تاریخِ وفات کہنے کا رواج اِسی مشکل کو حل کرنے کی غرض سے پھیلا ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اِن کی مدد سے حافظے کو ایسی تاریخیں یاد رکھنے میں آسانی ہوتی ہے جن کا بھول جانا ہی بہتر ہوتا۔ بعض شعرا بہ نظر احتیاط ہر سال

اپنا قطعہ تاریخِ وفات کہہ کر رکھ لیتے ہیں تا کہ مرنے کی سند رہے اور وقت ضرورت پس ماندگان کے کام آئے۔ یہ کون واقف نہیں کہ مرزا غالب نے جو مرنے کی آرزو میں مرتے تھے متعدد بار اپنی تاریخِ رحلت کہہ کر شاگردوں اور قرض خواہوں کو خواہ مخواہ ہراساں کیا ہوگا۔ لیکن جب قدرت نے ان کو مرنے کا ایک سنہری موقع فراہم کیا تو وہ یہ کہہ کر صاف ٹال گئے کہ وبائے عام میں مرنا ہماری کسرِ شان ہے۔

مارچ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے۔ بی اے کے امتحان میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا میں روہیلوں کی لڑائیوں سے فارغ ہو کر مرزا عبدالودود بیگ کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ جھوم جھوم کر کچھ رٹ رہے ہیں۔ پوچھا ''خیام پڑھ رہے ہو''۔

کہنے لگے ''نہیں یہ تو ہسٹری ہے''۔

''مگر آثار تو ہسٹیریا کے ہیں!''

اپنی اپنی جگہ پر دونوں سچے تھے انہوں نے غلط نہیں کہا۔ اگرچہ میرا خیال بھی صحیح نکلا کہ وہ شعر سے شغل فرما رہے ہیں۔ البتہ شعر پڑھتے وقت چہرے پر مرگی کی سی کیفیت؛ میں نے قوالوں کے سوا کسی اور کے چہرے پر اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ پھر خود ہی کہنے لگے ''چلو ہسٹری کی طرف سے تو اب بے فکری ہوگئی۔ قبلہ نانا جان نے پچاس مشاہیر کی تاریخ ولادت و وفات کے قطعے کہہ کر میرے حوالے کر دیے ہیں ان میں آدھے حفظ کر چکا ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے تیمور لنگ کی پیدائش اور رنجیت سنگھ کی رحلت کے قطعات بطور نمونہ گا کر سنائے۔

گھر پہنچ کر تخمینہ لگایا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ فی کس دو قطعات کے حساب سے اس شاہنامہ ہند کے چار سو مصرعے ہوئے اور اس میں ذیلی قطعات شامل نہیں۔ جن کا تعلق دیگر واقعات و موضوعات مثلاً جانا پرتھوی راج کا سوئمبر میں بھیس بدل کر اور لے بھاگنا سنجوگتا کو گھوڑے پر۔ آنا نادر شاہ کا ہندوستان میں واسطے لینے کوہ نور ہیرا برابر انڈے مرغابی کے۔ داخل ہونا واجد علی شاہ کا پہلے پہل مٹیا برج میں۔ تاریخی چھٹ بھیوں (ثانوی ہیرو) مثلاً رانا سانگا، ہیموں بقال، نظام سقہ وغیرہ سے تھا۔

حالاں کہ دماغی طور پر میں پانی پت کی لڑائیوں میں بری طرح زخمی ہو چکا تھا لیکن آخری قطعہ کو سن کر میں نے اُسی وقت دل میں فیصلہ کر لیا کہ امتحان میں باعزت طریقے سے فیل ہونا اس اوچھے ہتھیار سے ہزار درجہ بہتر ہوگا۔ بہر حال مرزا نے ایک ہفتہ بعد اِس کلیدِ کامیابی کو امتحان میں بے دریغ استعمال کیا جس میں انہیں دو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بڑی دشواری تو یہ کہ کاپی میں قطعات اور حروف ابجد کا حساب دیکھ کر کمرہ امتحان کا نگران، جو ایک مدراسی کرسچن تھا۔ بار بار ان کے پاس لپک کر آتا؛ اور سمجھا تا کہ اردو کا پرچہ کل ہے۔ مرزا جھنجھلا کر جواب دیتے کہ یہ ہمیں بھی معلوم ہے تو وہ نرمی سے پوچھتا کہ پھر یہ تعویذ کیوں لکھ رہے ہو۔ پایانِ کار مرزا نے وہیں کھڑے کھڑے اس فنِ تاریخ گوئی اور استخراجِ سنین کے رموز و نکات سے

غلط انگریزی میں آگاہ کیا۔ حیرت سے اس کا منہ سات کے ہندسہ کی مانند پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔ حروف واعداد کو بھٹی بھٹی نظروں سے دیکھ کر کہنے لگا۔

''تعجب ہے کہ تم لوگ ماضی کے واقعات کا پتا بھی علومِ نجوم سے لگا لیتے ہو''۔

اس مجسم دشواری کے علاوہ دوسری دِقّت یہ ہوئی کہ ابھی پانچوں سوالات کے جملہ بادشاہوں، راجاؤں اور جنگوں کے عدد اور سن بہ سہولت تمام نکلے بھی نہ تھے کہ وقت ختم ہو گیا اور نگران نے کاپی چھین لی۔ بڑی منت وسماجت کے بعد مرزا کو کاپی پر اپنا رول نمبر لکھنے کی اجازت ملی۔

جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں۔ مجھے سن یاد نہیں رہتا اور مرزا کو وہ واقعہ یاد نہیں رہتا جو اُس سن سے متعلق ہو فرض کیجیے مجھے کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کہ فرانسیسی انقلابیوں نے کسی صدی کے آخر میں قلعہ باستیل کا محاصرہ کیا تھا لیکن سن یاد نہیں آتا۔ اب مرزا کو یقیناً اتنا یاد ہوگا کہ ۱۷۸۹ء میں کچھ گڑ بڑ ضرور ہوئی تھی لیکن کہاں ہوئی اور کیوں ہوئی یہ بغیر استخارہ کیے نہیں بتا سکتے۔

ایک مفکر کہتا ہے کہ عظیم انقلاب کی کوئی تاریخ نہیں ہوتی تم دیکھو گے کہ زبردست تبدیلیاں ہمیشہ دبے پاؤں آتی ہیں۔ تاریخی کیلنڈر میں ان کا کہیں ذکر نہیں۔ سب جانتے ہیں سکندر نے کس سن میں کون سا ملک فتح کیا لیکن یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ بن مانس کون سے سن میں انسان بنا۔ اتنا تو اسکول کے بچے بھی بتا دیں گے کہ سیفو کب پیدا ہوئی اور سقراط نے کب زہر کا پیالہ اپنے ہونٹوں سے لگایا لیکن آج تک کوئی مورخ یہ نہیں بتا سکا کہ لڑکپن کس دن رخصت ہوا۔ جوانی کس رات ڈھلی۔ ادھیڑ پن کب ختم ہوا اور بڑھاپا کس گھڑی شروع ہوا''۔

سنہ عیسوی سے کہیں زیادہ مشکل ان تاریخوں کو یاد رکھنا ہے جن کے بعد میں ''قبل از مسیح'' آتا ہے اس لیے کہ یہاں مؤرخین گردشِ ایام کو پیچھے کی طرف دوڑاتے ہیں۔ ان کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے شیش آسن کرنا پڑتا ہے جو اتنا ہی دشوار ہے جتنا الٹے پہاڑے سنانا۔ اس کو طالب علموں کی خوش قسمتی کہیئے کہ تاریخ قبل از میلادِ مسیح نسبتاً مختصر اور ادھوری ہے۔ اگرچہ مؤرخین کوشاں ہیں کہ جدید تحقیق سے بے زبان بچوں کی مشکلات میں اضافہ کر دیں۔ بھولے بھالے بچوں کو جب یہ بتایا جاتا ہے کہ روم کی داغ بیل ۷۵۳ ق م کو ساتویں صدی شمار کریں یا آٹھویں۔ عقل مند استاد ان جاہلانہ سوالات کا جواب عموماً خاموشی سے دیتے ہیں۔ آگے چل کر جب یہی بچے پڑھتے ہیں کہ سکندر ۳۵۶ ق م میں پیدا ہوا اور ۳۲۳ ق م میں فوت ہوا تو وہ اسے کتابت کی غلطی سمجھتے ہوئے استاد سے پوچھتے ہیں کہ یہ بادشاہ پیدا ہونے سے پہلے کس طرح مرا؟ استاد جواب دیتا ہے کہ پیارے بچو! اگلے وقتوں میں ظالم بادشاہ اسی طرح مرا کرتے تھے۔

یہ واقعہ ہے کہ حافظہ خراب ہو تو آدمی زیادہ عرصہ تک جوان رہتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وقت کا احساس بذاتِ خود

ایک آزار ہے جس کو اصطلاحاً بڑھاپا کہتے ہیں۔ ڈاکٹر جانسن نے غلط نہیں کہا کہ "یوں تو مجھے دو بیماریاں ہیں۔ دمہ اور جلندھر لیکن تیسری بیماری لاعلاج ہے اور وہ ہے عمرِ طبعی"۔

میں یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کررہا کہ اگر سن پیدائش یادرکھنے کا رواج بیک گردش چرخِ نیلوفری اٹھ جائے تو بال سفید ہونے بند ہوجائیں گے یا کیلنڈر ایجاد نہ ہوا ہوتا تو کسی کے دانت نہ گرتے۔ تاہم اس میں کلام نہیں کہ جس شخص نے بھی ناقابلِ تقسیم رواں دواں وقت کو پہلی بار سیکنڈ، سال اور صدی میں تقسیم کیا اس نے انسان کو صحیح معنوں میں پیری اور موت کا ذائقہ چکھایا۔ وقت کو انسان جتنی بار تقسیم کرے گا زندگی کی رفتار اتنی ہی تیز اور نتیجتاً موت اتنی ہی قریب ہوتی جائے گی۔ اب جب کہ زندگی اپنے آپ کو کافی کے چمچوں اور گھڑی کی ٹک ٹک سے ناپتی ہے تہذیب یافتہ انسان اس لوٹ کر نہ آنے والے نیم روشن عہد کی طرف پیچھے مڑمڑ کر دیکھتا ہے جب وہ وقت کا شمار دل کی دھڑکنوں سے کرتا تھا اور عروسِ نو رات ڈھلنے کا اندازہ کانوں کے موتیوں کے ٹھنڈے ہونے اور ستاروں کے جھلملانے سے لگاتی تھی۔

نہ گھڑی ہے واں نہ گھنٹہ نہ شمار وقت و ساعت
مگر اے چمکنے والو! ہو تمھیں انہیں سُجھاتے
کہ گئی ہے رات کتنی

(چراغ تلے)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) مصنف کے ایامِ جوانی کس طرح گزر گئے؟

ب) مصنف محمود غزنوی سے کیوں نالاں ہیں؟

ج) مصنف اولادِ آدم کی مصیبتوں کی ذمہ داری مشاہیر عالم پر کیوں ڈالتے ہیں؟

د) بقول مصنف اس کی کتنی بہاریں اس سالانہ جاں کنی کی نذر ہوگئیں؟

ہ) بقول مصنف مرزا عبدالودود بیگ امتحان میں کس طرح اول آئے؟

و) مصنف مارچ کے مہینے سے کیوں گھبراتا تھا؟

ز) مصنف کے خیال میں بعض شعرا کیوں ہر سال اپنا قطعہ تاریخ کہتے ہیں؟

ح) دورانِ امتحان ممتحن مرزا عبدالودود بیگ کے پاس بار بار کیوں آتا تھا؟

۲۔ متن کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) ''سنہ'' صنفِ ادب کے لحاظ سے ایک مضمون ہے۔

i) طربیہ
ii) المیہ
iii) طنزیہ
iv) طنزیہ و مزاحیہ

ب) مضمون ''سنہ'' کا مصنف ہے۔

i) پطرس بخاری
ii) فرحت اللہ بیگ
iii) شفیق الرحمٰن
iv) مشتاق احمد یوسفی

ج) مضمون ''سنہ'' مشتاق احمد یوسفی کی کتاب سے لیا گیا ہے۔

i) آب گم
ii) سرگزشت
iii) شامِ شہرِ یاراں
iv) چراغ تلے

د) بقول مرزا عبدالودود بیگ ممتحن متاثر ہوتے ہیں۔

i) سن لکھنے سے
ii) خوشخطی سے
iii) طویل جواب دینے سے
iv) مختلف رنگوں کے استعمال سے

ہ) مصنف پانی پت کی لڑائی میں زخمی ہوئے تھے۔

i) جسمانی طور پر
ii) نفسیاتی طور پر
iii) ذہنی طور پر
iv) معاشی طور پر

۳۔ متن کے مطابق درست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) نالائق طلبہ صرف سن لکھنے سے فرسٹ آتے ہیں۔

ب) ترقی یافتہ ممالک میں مارچ کا مہینہ بے حد بہار آفرین ہوتا ہے۔

ج) مصنف آسانی سے سن یاد کرتے تھے۔

د) مرزا عبدالودود بیگ کو امتحان میں تین قسم کی دشواریاں درپیش تھیں۔

ہ) بقول مفکرِ عظیم انقلاب جلدی رونما ہو جاتا ہے۔

۴۔ متن کے مطابق درست الفاظ سے خالی جگہیں پُر کریں۔

الف) نانا جان نے پچاس مشاہیر کے تاریخ ولادت وفات کے قطعے یاد کرنے کے لیے .... کے حوالے کیے تھے۔

ب) امتحان کا نگران مرزا عبدالودود بیگ کے پرچے میں قطعات کو علم .... سمجھتا تھا۔

ج) مصنف کو سن جب کہ مرزا عبدالودود بیگ کو .... یاد نہیں رہتے تھے۔

د) عقل مند استاد، ان جاہلانہ سوالات کے جواب .... سے دیتے ہیں۔

ہ) حافظہ خراب ہو تو آدمی زیادہ عرصہ تک .... رہتا ہے۔

۵۔ بہ حوالہ متن درج ذیل عبارت کی تشریح کریں۔ نیز سیاق و سباق بھی لکھیں۔

''سنہ عیسوی سے کہیں زیادہ مشکل ان تاریخوں .... ظالم بادشاہ اسی طرح مرا کرتے تھے''۔

۶۔ طنزیہ مزاحیہ مضمون ''سنہ'' کا مرکزی خیال بیان کریں۔

۷۔ مضمون ''سنہ'' میں بیان کیے گئے تجربات میں سے اگر آپ بھی گزرے ہوں تو اِسے اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۸۔ آپ مضمون ''سنہ'' میں بیان کیے گئے مصنف کے خیالات سے کس حد تک اتفاق یا اختلاف کرتے ہیں اور کیوں؟

۹۔ مضمون ''سنہ'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

۱۰۔ مضمون ''سنہ'' کی روشنی میں امتحانی نظام کا ایک تنقیدی جائزہ لیں۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے کسی بھی ادبی، علمی یا صحافتی موضوع پر درست لب و لہجہ اور تلفظ کے ساتھ دس منٹ سے زیادہ کی لکھی ہوئی تقریر دیکھ کر پڑھوائیں۔

۲۔ خاص علوم اور پیشوں کے اصطلاحی نکات کا استعمال کروائیں۔

۳۔ کمرہ جماعت میں مشتاق احمد یوسفی کا کوئی اور طنزیہ و مزاحیہ مضمون سنوائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ طلبہ کو جدید اُردو ادب میں طنز و مزاح کی اہمیت سے آگاہ کریں۔ ۲۔ جدید اُردو ادب میں مشتاق احمد یوسفی کا مقام بتائیں۔

۳۔ مشتاق احمد یوسفی کے طرزِ تحریر پر لیکچر دیں۔ ۴۔ طنز و مزاح کے سنجیدہ پہلوؤں سے آگاہ کریں۔